Date of Publication : 23-08-2014
PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 August 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 September 2014
Issue: 33, Vol.:73

یکم تا ۷ر ستمبر ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۳۳، جلد نمبر: ۷۳

ہندستانی ذہن و تہذیب کا گل نغمہ

فراق کی 118ویں پیدائش پر خراج عقیدت

پروفیسر علی احمد فاطمی (شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد)

فراق گورکھپوری عام طور پر شاعرِ عشق و محبت یا شاعرِ حسن و جمال کے طور پر جانے پہچانے گئے ہیں۔ اور یہ سچ بھی ہے لیکن اس سے بڑا سچ یہ بھی ہے کہ فراق کی شاعری ایک ایسا دریا ہے جس میں فکر کے کئی دھارے اور تہذیب کے کئی زاویے مختلف سمتوں میں آکر ملتے ہیں۔ اگر ایک طرف اردو کی کلاسیکی شاعری نے انھیں عربی و عجمی لب و لہجہ سے آشنا کیا تو دوسری طرف انگریزی ادب کے طالب علم اور بعد میں استاد ہونے کی وجہ سے وہ انگریزی شاعری بالخصوص رومانی شاعری سے سرشار ہوئے جس کی سرشاری کے آثار ان کی اردو کی رومانی شاعری میں بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ تیسرا پہلو جو میری نظر میں سب سے اہم پہلو ہے اور جو خارج و باطن پر سطح سے نظر آتا ہے لیکن اس پر غور کم سے کم کیا گیا ہے اور وہ ہے ہندو اور ہندستانی تہذیب کے اثرات۔ سب جانتے ہیں کہ فراق کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا اور ان کے سارے سنسکار کا نستھ گھرانے کے تھے، اس لیے، ان مذہبی و تہذیبی عناصر کا در آنا تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ میں اس موضوع پر فلسفیانہ گفتگو کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ انھوں نے اپنے انگریزی کے مضمون what is great poetry میں ایک جگہ صاف طور پر لکھا ہے کہ ان کی شاعری کی اصل بنیاد ہندو فلسفے پر ہے شاید اسی لیے ایک مضمون میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ فراق کی شاعری میں حیات و کائنات، انسان، خدا، حسن و عشق، زندگی اور موت کا جو تصور ہے وہ خالص ویدک فلسفے پر مبنی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کئی بار انھوں نے ذاتی نوعیت کی گفتگو میں بھی راقم الحروف سے فرمایا کہ شاعری صرف رس کی عشق و حسن سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ ایک کائناتی حقیقت universal truth کا انکشاف کرتی ہے۔ یہ عناصر فراق کی عشقیہ شاعری میں بھی جا بجا ملتے نظر آتے ہیں:



ترا فراق تو اس دم ترا فراق ہوا
جب ان کو پیار کیا میں نے جن سے پیار نہیں

حاصلِ حسن و عشق بس ہے یہی
آدمی آدمی کو پہچانے

میری غزل میں ملے گا تجھے وہ عالمِ راز
جہاں ہے ایک ازل سے حقیقت اور مجاز

شاعری بس اسی کا ہے اظہار
ربط پنہاں جو کائنات سے ہے

لیکن یہاں مجھے ہندو فلسفے سے زیادہ ہندستانی تہذیب پر گفتگو کرنی ہے لیکن یہ ہندستانی تہذیب کسی بھی طرح ہندو مذہب اور فلسفے سے الگ نہیں ہے بلکہ غالب حصہ وہی ہے جس میں دوسری تہذیبوں نے مل کر مشترکہ تہذیب کو نئے رنگ دیے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے جو اردو غزل میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں:

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی کیا ہے رام کا بن باس

شیو کا وِش پان تو سنا ہوگا
میں بھی اے دوست پی گیا آنسو

ایسے متعدد اشعار ہیں جن میں انکسار کے ذریعے ہی اندازہ ہو جاتا ہے لیکن کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جن میں ہندو اور ہندستانی تہذیب کا رس اور جس بڑے سلیقہ سے گھل مل گیا ہے جو غزل کے اشعار میں کہیں جگنو اور کہیں جگنو کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

دلوں میں تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

مری حیات تو وِش پان کی کتھا ہے ندیم
میں زہر پی کے زمانے کو دے گیا امرت

لٹکے لٹکے کالے گیسو گورے گورے لیے بازو

دل کے رواں ہیں گنگ و جمن ساتھ خراماں رام لچھمن
کچھ غم دوراں کچھ غم جاناں، کچھ غم عشق
ایک مہا بھارت لکھوا لی انھیں چند آنسوؤں نے

فراق نے جس قدر ہندو فلسفے سے اثر لیا اسی طرح انھوں نے قدیم ہندی شاعری اور سنسکرت شاعری کے تجربوں سے بھی خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ سنسکرت کا ڈراما نویس بھاس کہتا ہے کہ پچھلے پہر مندروں میں جلتے ہوئے چراغ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ اب فراق کا یہ شعر دیکھیے:

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

چراغ سے چراغ جلتے ہیں خیال لیتا ایسی

کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن اسے اپنے انداز و اسلوب میں ڈھال کر عمدہ و مستحق شعر کہنا کہ وہ اوروں کے معمولی بات نہیں۔ یہ لیجیے معمولی پن فراق کے یہاں جا بجا نظر آتا ہے۔ شعر میں ضروری نہیں کہ ہر وقت کوئی بڑا فلسفہ ہی کام کرتا دکھائی دے۔ اکثر عشقیہ اشعار کی روانی میں بھی ہندی الفاظ اور ہندستانی تہذیب کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک ہی غزل کے چند مصرعے دیکھیے

اک اک کلی رتی ہے ہر انساں کی بیرون اعضا
حسن اک سینہ صاف موتی یا اک سینہ سنگھا ہوا پھول
رات چلے ہو کے من کر بال سنوارے رات چھلائے

مجھے فراق ملی ہے وہ تب دیپ بجھے ہر کلی ہو تب بھی
یا یہ شعر دیکھیے:

روپ کی چاندنی سوز دل سوز دل
موہنی گنگ و جمن ساز جاں ساز جاں
کرشن کی بانسری سے دیکھو
سجی چمن تھن تھن

فراق خود ایک جگہ کہتے ہیں:
"میں نے اپنی غزلوں میں چاہا ہے کہ اپنے اہل وطن کو ہندستان کا اور ہندستان کے مزاج اور روح عصر کا بھی ایک صحت مند تصور دے دوں۔ میں نے چاہا کہ میری شاعری اس دھرتی کی شاعری رہے یعنی اس میں وہ دھرتی بولتی اور رقص کرتی دکھائی دے جو کروڑوں سال پہلے پرانی ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ اپنے آپ کو نیا کرتی ہے۔ وہ دھرتی جو سدا سہاگ اور سدا بہار ہے۔"

یہ باتیں غزلوں سے متعلق ہیں لیکن سچ پوچھیے تو ان کی نظموں اور رباعیوں میں یہ خیالات اور تخیلات پھیل کر آتے ہیں۔ نظموں اور رباعیوں کا مزاج و وسعت بھی اپنے آپ میں غزل سے زیادہ امکانات رکھتی ہیں۔

فراق کو بے خوابی کا روگ تھا جس کی وجہ سے انھیں نیند نہ آتی تھی پوری پوری رات جاگ کر گزرتی تھی چناں چہ ان کی شاعری میں رات کی تمام کیفیت و رمزیت کا ذکر خوب خوب ملتا ہے۔ پوری نظم ہے 'آدھی رات'۔ اس کا دوسرا بند کچھ یوں ہے:

تمولیوں کی دکانیں کہیں کہیں ہیں کھلی
کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پر
سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں
کھڑا ہے اوس میں چپ چاپ ہرسنگار کا پیڑ

تمولی، دوکانیں، جھنکار، ہرسنگار، تمام ہندستانی سماج کی دلکش تصویریں ہیں جس سے ایک عجیب سی اپنائیت اور رنگینی مہک محسوس ہوتی ہے اور اس مصرعہ میں تو صرف مہک نہیں بلکہ پوری تاریخ، تہذیب اور تقدس سمٹ آئی ہے۔

کنول کی پتیوں میں بند ہے ندی کا سہاگ

کنول، چنچل اور سہاگ نے وہ امیجز تیار کردی ہیں کہ جس میں ہندستانی تہذیب کنول کی طرح کھلتی دکھائی دیتی ہے۔ کنول کی پتی، چنچل اور سہاگ نے تو ایسی تثلیث تیار کردی ہے جس میں پوری ہندستانیت نظر آتی ہے۔ چند مصرعے اور ملاحظہ کیجیے:

یہ رس کا بیج یہ سنکار یہ سکول کا گات
یہ کمل کی چمک کام روپ کا جادو

(باقی صفحہ ۷ پر)

مشتاق احمد یوسفی

دوسری اور آخری قسط

غلام رضوی گردش

پہلی بار ۱۹۵۶ء میں انسپکٹر آف برانچز کی حیثیت سے ایک بینک فراڈ کے سلسلے میں یوسفی کو ڈھاکہ جانا پڑا۔ دوسری بار ۱۹۶۷ء میں کار اور فیری سے اس شہر اور اس کے گرد و نواح کا دورہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے دیکھا، چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ایک بوڑھی عورت، دو تین معصوم بچوں کے ساتھ کوڑے کے ڈھیر میں ناریل تلاش کر رہی ہے۔ غربت اور کس مپرسی کی یہ تصویر دیکھ کر دل پر ایک چوٹ سی لگی... "نہ تو دیکھنے والوں کو، نہ خود اس مائی کو، اپنے ننگے ہونے کا احساس تھا، لیکن اس دن، میں نے اپنے آپ کو بالکل ننگا محسوس کیا!"

ان دنوں یوسفی بیک وقت سکریٹری، چیف اکاؤنٹنٹ اور انسپکٹر آف برانچز کے عہدوں پر فائز تھے۔ چناں چہ ڈھائی تین برس تک کبھی گیارہ بجے سے پہلے فراغت نہیں ہوئی۔

"کافی عرصے تک کھڑے ہوکر اونچے کاؤنٹر پر خود کام کیا یا اوروں کا چیک کیا۔ رفتہ رفتہ صحت گری تو شام تک پیروں پر اتنا ورم آجاتا کہ سات بجے کے بعد جوتے اتارنے پڑتے"۔

انھیں اکثر سات آٹھ میل پیدل ہی گھر جانا پڑتا۔ رات کے دو تین بج جاتے، جوں توں گھر پہنچتے تو بیوی آنکھیں تکتی ہوئی اٹھتی۔ پھر کھانا گرم کرتی اور دونوں ساتھ کھاتے۔

"وہ ایک پرائیوٹ اسکول میں پڑھانے لگی تھی، تنخواہ دونوں بچوں کے دودھ کے ڈبوں کے برابر۔ ہمارے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا کہ کوئی یہ نہیں بتائے گا کہ دن کیسا کٹا۔"

انتہائی ناسازگار حالات لیکن مفر کی کوئی صورت نہیں تھی اور ان کی زندگی:

بے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی

کے مصداق ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سہتے چلے گئے۔ "مشقت ہی مشقت، تھکن اور ایسی اتھوٹ تھکن کہ ایک ایک مسام میں اتر جائے اور ہڈیوں تک کو چٹخا دے۔ رُواں رُواں کراہنے لگتا۔ کبھی کبھی بے اختیار جی چاہتا، اب کے ایسے سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں!"

لیکن پھر صبح چھ بجے اٹھ جاتے اور سات تک تیار ہوکر کالونی کے بس اسٹینڈ پر دھینگا مشتی کرنے کے بجائے ڈھائی تین میل پیدل چل کر گرومندر پہنچتے، وہاں سے ۱۹ نمبر کی بس آسانی سے مل جاتی۔ ساڑھے آٹھ تک بینک میں حاضر ہوجاتے اور پھر۔

"اس گلی میں پٹے جس کے وہ
پاٹن تیج آج تک کوئی ثابت نہ بچا!"

دفتر میں داہنی جانب ایک کھڑکی تھی جو سڑک کی طرف کھلتی لیکن اینڈرسن کا حکم تھا، اسے ہمیشہ بند رکھا جائے۔ زنگ اور دیمک کی وجہ سے اس میں ایک ذیلی کھڑکی بن گئی تھی۔ وہ اکثر اس 'شاہجہانی روزن' سے سڑک کی سیر دیکھتے۔

یوسفی کی شخصیت کے سوز و گداز، ان کی دردمندی و دل سوزی کو سمجھنے کے لیے اس روزن کی کہانی سنیے۔ "چند روز سے ہم دیکھ رہے تھے کہ ایک سفید بلی مع پانچ بچوں سمیت آکر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک دن اس نے بہت میاؤں میاؤں کی تو ہم نے ملباری چائے والے کو آنہ پیسہ دے کر اسے دودھ پلوا دیا۔ اس کے بعد یہ روز مرہ کا اصول ہوگیا۔ اس کے بھی چار بچے تھے!"

اچانک موسم نے کروٹ بدلی اور شہر میں موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل ہوگیا۔ اسٹاف کو ساڑھے تین بجے ہی چھٹی دے دی گئی اور یوسفی بھی چھ بجے تک اٹھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں۔

"وقت معینہ سے کافی پہلے موتی (بلی) آئی۔ ہم نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کل تین آنے۔ اب اسے اور اس کے بچوں کو ایک آنے کا دودھ پلوا دیتے تو بس کے ٹکٹ میں دو پیسے کم پڑ جاتے۔ وہ کھڑکی کے نیچے بھیگتی رہی۔ روتی رہی۔ ہم نے پرواہ نہ کی۔ پھر اس نے پنجوں سے کھڑکھڑ کی اور بار بار روزن سے جھانکنے لگی تو ہم نے اسے بھاڑن سے ڈھک دیا کہ یکسوئی سے کام سمیٹ سکیں۔ (پھر) بارش ذرا تھمی۔ ہم اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے کہ چائے والا کھڑکی کو کھٹکھٹانے لگا۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے؟ کہنے لگا، بابوجی، تمھاری بلی ریلی برادرز کے ٹرک کے نیچے آکر مرگئی۔ یہ تو اس کے بچے، بلک رہے تھے، یہ خون تمھاری گردن پر... بارش پھر تیز ہوگئی اور ہم نے کھڑکی کھول کر (اپنے) تین آنے بچے ہوئے بھی پھینک دیے!"

یوسفی کو ان دنوں تھیٹرز کا بھی چسکا تھا۔ غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے جب شہر کی پہلی اور آخری تھیٹریکل کمپنی اپنے کھیل دکھا رہی تھی۔ ایک دن "رومیو جولیٹ بہ مع چار کتھک رقص" دیکھنے بیٹھے ہی تھے کہ اتنے میں اینڈرسن کا ڈرائیور غفار ہانپتا کانپتا پہنچا اور کہنے لگا... "آپ کو تاش بینی کی پڑی ہے۔ ادھر بڑا صاحب منہ اندھیرے سے اودھم مچا رہا ہے۔ آپ کو سلام بولتا ہے۔ آرزو ہے کہ آپ جس حالت میں بھی ہوں، گاڑی میں ڈال کر حاضر کردوں!"

اینڈرسن نے مژدہ سنایا۔ "کل شام بورڈ آف ڈائرکٹرز نے لطیفی کو برخاست کردیا۔ اسی وقت میری کار میں جا کر اس کی تجوری، الماریاں اور میز کی درازیں اور جو کچھ بھی اس کا نظر آئے، سیل کردو۔ چٹ پر اپنے دستخط کر کے چپکا دینا اور صبح ٹھیک نو بجے اس سے کیش کا چارج لے لینا۔ ترقی مبارک، اور ہاں اس کی کار بھی اپنی تحویل میں لے لینا!"

یوسفی کہتے ہیں: "دن بھر ہم اپنے نئے فرائض نہایت جوش اور تندہی سے انجام دیتے رہے۔ رات کو ٹھاٹ سے لطیفی صاحب کی کار میں گھر گئے۔ بچوں نے لالٹین کی روشنی میں ہماری کار اور ترقی کا ہر زاویہ سے معائنہ کیا۔ انھیں ڈرائیور کی ٹوپی بہت پسند آئی۔ بیگم نے مڈگارڈ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ ہلکا سبز رنگ مجھے شادی سے پہلے بھی پسند تھا۔ ماں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا، بیٹا تم نے آج بھی روٹی کھائی یا نہیں؟"

دوسرے دن یوم آزادی کی تعطیل تھی۔ بعد ازاں دفتر پہنچے تو کرسی پر ایک ڈائرکٹر کے منہ چڑھے افسر نور علی نجم الدین کو بیٹھے دیکھا۔

"ہماری ہر الماری، کیبنٹ، دراز اور تجوری پر ان کی دستخطی سلپ چسپاں تھی۔ انھوں نے اپنی تقرری اور ہمارے جاوے کا پروانہ دکھایا۔ رات گئے حسب

معمول بس کے ڈنڈے میں باہیں حمائل کیے گھر آئے۔ بیگم نے پوچھا کار کہاں گئی؟ بچوں نے پوچھا، کیا ڈرائیور بھی چھین لیا؟ ماں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا، بیٹا! تم نے آج بھی روٹی کھائی یا نہیں؟"

یوسفی اس دل چسپ ناٹک کو ایک بلیغ جملے پر ختم کرتے ہیں۔ "نظام سقہ کو اس کی مشک واپس مل گئی!"

(پردہ گرتا ہے)

آخرش دن بدلے، ترقی کے بعد ترقی ہوئی، مکان بھی تبدیل کر دیا اور اب "لباس اور اس کے لوازمات سے بھی نخوت جھلکتی یعنی ہائی کی گرہ پھولی ہوئی ہوتی!"

یوسفی نے زندگی کو ہر رنگ میں دیکھا اور برتا ہے۔ ایک دن نواب زادہ نصر اللہ خاں انھیں اپنی زمین دوز "بار" میں لے گئے اور "ٹوپ فرینڈ" دکھایا جس میں طرح طرح کی شرابیں بند تھیں۔ بائیں جانب طاقچے پر کوتھک طرز کی ایک خانقاہ بنی تھی اور اس کے دروازے پر سیموئل جانسن کے وہ اشعار کندہ تھے جن کی تشریح یوں کی ہے:

"اے ضعیف العمر راہب!... اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کے بتا کہ حقیقی مسرت کیا ہے اور اس کا راستہ کون سا ہے؟ میں اپنے استفسار کرتے ہوئے آنسوؤں کو روک ہی رہا تھا کہ وہ بولا بیٹا! میرے ساتھ آؤ اور تھوڑی سی بیئر پیو!"

جوانی میں ٹی بی کے جراثیم کا حملہ، پھر ۱۹۷۵ء میں معدے سے خون آنے کی شکایت اور ۱۹۹۰ء میں لندن میں بائی پاس سرجری لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

یوسفی نجی زندگی میں خاصے توہم پرست ہیں اور ۸ کے ہندسے کو اپنے حق میں نحس سمجھتے ہیں۔ ان اعداد کو بھی جن کا حاصل جمع ۸ ہو۔ چناں چہ ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھ کر ساری رات گزار دیں گے لیکن اس کمرے میں نہیں ٹھہریں گے جس کا نمبر ۵۱۲ ہے۔

موصوف بہت کم سخن، کم آمیز اور بند بند سے رہتے ہیں۔ ساری زندگی بینک میں کرسی نشین تھے، اب گھر میں فرش نشین ہیں۔ بینک میں کوٹ، پتلون، ٹائی اور بوٹ لیکن گھر میں کرتا پاجامہ اور چپل! ہمیشہ فرش پر بیٹھ کر لکھتے ہیں لیکن پڑھتے عموماً لیٹ کر ہیں اور اتنا پڑھتے ہیں کہ ہر رات کے بعد صبح کو جس یوسفی سے ملاقات ہوتی ہے وہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہوتا ہے!

خوراک بقدر قلیل، لیکن اس معاملے میں صرف ایک شوق بڑی وضع داری سے نبھائے جا رہے ہیں یعنی جمعہ کی صبح پوری چھولے کا ناشتہ۔ موصوف یوں تو غالب، باخ، بے اور جنتری کے پرانے عاشق ہیں، قوالی کا بھی چسکا رہا ہے لیکن ٹیپ میں مسلسل زیدی (شیخ الہ آبادی) کی کئی غزلیں جو سانحۂ قتل سے چند ہی روز پہلے ریکارڈ کی گئی تھیں، محفوظ ہیں جن سے فرصت کے لمحات میں جی بہلاتے ہیں۔

سب سے اہم اور دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی ڈشیں اور مسودات تحریر نازک سرے والی کچی پنسل سے لکھتے ہیں اور جب چاندنی پر گاؤ تکیے کے سہارے لکھنے بیٹھ ہی گئے تو سبز قہوے کی ایک چھوٹی سی پیالی اور بکی پنسلوں سے بھرا ہوا ایک پیالہ سامنے رکھ لیا اور پھر لفظوں کی فسوں طرازی شروع ہو گئی۔

ایک روز ترنگ اٹھی تو ہر ایک سے پوچھتے رہ گئے کہ سولہ سنگھار اور بارہ مسالے کا محاورہ ہم اکثر بولتے ہیں مگر حضور والا، ان چیزوں کی ذرا فہرست تو بتائیے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی نٹ کھٹ بالک ان کے اندر ہر وقت چنے کھیلنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔

جنوری ۱۹۷۹ء سے اکتوبر ۱۹۸۹ء تک ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے زیر سرپرستی یوسفی تقریباً گیارہ سال لندن میں مقیم تھے جہاں اس عرصے میں "آب گم" کی تخلیق ہوئی۔ وہاں بینک میں اگر اچانک کوئی دوست یا ہم وطن وارد ہو جاتا تو دن میں "ٹریل پی" (Busy Businessman's Breakfast) پر ٹرخا دیتے لیکن رات میں گھر پر مخصوص ڈنر کا اہتمام رہتا۔ یعنی نہاری، مرغ، پلاؤ وغیرہ!

یوسفی کا کہنا ہے۔ "مزاح نگار کے لیے نصیحت، فضیحت اور فہمائش حرام ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی انگلی نہ اٹھا سکے کہ... یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے!"

اور پھر یوں بھی ارشاد ہے... "ماورائے تبسم، وہ اہتزاز اور مزاح جو سوچ، سچائی اور دانائی سے عاری ہے وہ پھکڑپن اور مسخرہ پن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ زر، زن، زمین اور زبان کی دنیا یک رخی، یک چشموں کی دنیا ہے مگر تجلی کی سیکڑوں آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ ان سب کی مجموعی مدد سے دیکھتی ہے!"

یوسفی کا وجود بھی اس خوش نما تجلی سے عبارت ہے!

اس تجلی کی ایک آنکھ زندگی کے ہر شعبے میں مزاح کی شگفتگی کے پہلو ڈھونڈ نکالتی ہے۔ "تو تے والی بات دل کو نہیں لگی۔ اس لیے کرتے تو اگر 'ما' نہ لکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ زیادہ برا معلوم ہوتا ہے بلکہ 'ما' کا دائرہ ذرا ڈھنگ سے بنائیں تو چونچ بھی نظر آنے لگتی ہے!"

"یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانس کی تلیا، بالی عمریا اور بچی وازمی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو، اتنی ہی چمکتی ہے!"

"ریاضت علی سوختہ مصور درد کہلاتے تھے۔ ہمارے سر میں بھی ان کے مقالوں سے کئی دفعہ وہ درد ہوا جس کے یہ مصور کہلائے جاتے!"

"بینک میں لکھتے سب انگریزی میں تھے، گفتگو اردو میں، لیکن گالی ہر شخص اپنی مادری زبان میں ہی دیتا... زبان غیر سے شرح آرزو کرتے۔"

یوسفی کا قول ہے: "اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسّے پر اترا اترا کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ... رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر۔"

چناں چہ تجلی کی دوسری آنکھ معاشرے پر طنز کے ان گنت پہلو نکال لیتی ہے... "جو کریٹ، بوریاں اور پیٹیاں بندرگاہ پر پڑی ہیں انھیں مردہ بیٹر نے کھولا تو اندر پتھر، کوئلے، لوہے کے ٹکڑے اور ڈان اخبار کی ردی نکلی۔ چند لاشیں بھی برآمد ہوئیں، جو ان چوہوں کی تھیں جو اخبار مذکور الصدر کا اداریہ کھاتے ہی ڈھیر ہو گئے!"

"جوش صاحب نے تو ۱۸ (معاشقوں) پر پہنچ کر غالباً اس لیے ڈکلیئر کر دیا کہ محمود غزنوی کے کل حملوں کی تعداد ۱۷ تھی، اتنا فرق ضرور ہے کہ جوش صاحب سومنات میں بغیر گرز کے داخل ہوئے!"

"ایک روٹی سی کتیا تھی، نام ماتا ہری رکھ چھوڑا تھا، چال جیسے قرۃ العین حیدر کی کہانی، پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی۔ خوش قسمتی سے گلی گلی چرچے!"

"ایک مشاعرے میں حضرت علی سردار جعفری کو دس بارہ طویل نظمیں سنانے کے بعد ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈائس سے اترتے دیکھا۔ خیر، ایسی واردات کے بعد تو ہاتھ جوڑنے کی وجہ ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے۔"

تجلی کی تیسری آنکھ زندگی کے رازہائے سربستہ اور فلسفیانہ موشگافیوں پر مرکوز رہتی ہے۔ "انسان کی کوئی محرومی خالی از حکمت نہیں۔"

"خوش دلی کی ایک منزل، بے حسی سے پہلے پڑتی ہے، اور ایک اس کے بعد آتی ہے۔"

"حوادث کو روکا نہیں جا سکتا، ہاں تہذیب حواس سے، حوادث کا زور توڑا جا سکتا ہے۔"

"دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی، کسی کھیل میں منہمک بچے سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔"

تجلی کی چوتھی آنکھ زندگی کے عام مشاہدات کا جائزہ لیتی ہے۔ "آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فلیٹ میں پناہ لیتا ہے۔"

"سانپ کا زہر کینچلی میں اور بچھو کا دم میں ہوتا ہے۔ بھڑ کا زہر ڈنک میں رہتا ہے اور پاگل کتے کا زبان میں۔ انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔"

"بھیرویں اور خوشامد سدا سہاگن راگنیاں ہیں۔ سننے والے کا جی نہیں بھرتا!"

"دھرتی اپنا آپا اور بھید بھاؤ جوتے کے تلے کو نہیں دکھایا کرتی۔"

تجلی کی پانچویں آنکھ نادر تشبیہوں اور استعاروں کی متلاشی رہتی ہے... "محاورے تو زبان کے بڑھے ہوئے ناخن ہوتے ہیں۔"

"دستخط کیا تھے لگتا تھا کوئی لنگڑا کاکروچ دوات میں غسل کر کے کاغذ پر سے گزر گیا ہے۔"

"پہاڑ اور ادھیڑ عورت، دراصل آئل پینٹنگ کی طرح ہوتے ہیں۔ انھیں ذرا فاصلے سے دیکھنا چاہیے۔"

"قلفیں بھی اونچی بچی جیسے ٹرنچ کے بیس منت ہونے ہوں۔"

"بجلی کے تاروں پر تنے اوپر بیٹھی ہوئی چڑیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے مغربی موسیقی کی نوٹیشن۔"

تجلی کی چھٹی آنکھ نثر میں ایسی شاعری کرتی ہے جو "نا طلبیدا" سے عبارت ہے۔ "ڈیلٹا، پہاڑوں، جنگلوں اور دیہاتوں میں جا بجا جو قریے یوں منہ لٹکائے یوں دلی کلون لگائے، سگار منہ میں، ہر مہاشس بیئر میں بسا ہوا باتوں میں ڈرائنگ روم کی مہک... اس سے دیہات کی بھینی بھینی خوشبوئیں دب جاتی ہیں، وہ بھی کسی خوشبوئیں جو یاد دلاتی ہیں کہ یہاں سے دیہات کی سرحد شروع ہوتی ہے۔"

اور پھر... "ٹین کی چھت پر تڑ تڑ بجتے ہوئے تاشے، سوکھے پتوں پر کراری بوندوں کا شور، تپتی کھپریلوں پر اڑتی بدلی کے بھاپے کی سنسناہٹ، ڈھولک پر ساون کے گیت کی تال پر کھنکتی چوڑیاں اور بے تال تیجے، تھونی سے لگی ہوئی لالٹین کے سامنے تا حد روشنی، موتیوں کی رم جھم جھالر، بھک بھک کر پرانے آنگن میں گرتے پرنالے، اور بھری رات کے سناٹے میں، پانی رکنے کے بعد سوتے جاگتے میں اولتی کی ٹپ ٹپ!"

اور جب یہ خوش نما تجلی اپنی سیکڑوں آنکھوں کی مجموعی مدد سے دیکھتی ہے تو ہمیں آسمان ادب پر "ستارۂ امتیاز" اچانک روشن دکھائی دیتا ہے۔

تلمیحات اور ان کے اختصار سے بیانیہ میں چار چاند لگا دینا، بائی یا بیٹے کا نشان اور کبھی کسی لفظ کے ایک ٹکڑے کو قوسین میں رکھ کر بات کہاں سے کہاں پہنچا دینا، کلاسیکی اور جدید شعرا کے اشعار اور مصرعوں کو ہلکے سے رد و بدل کے بعد یوں استعمال کرنا کہ ان کے معنی یکسر بدل جائیں، زبان کے محاورات، ضرب الامثال اور روزمرہ کو صرف تفنن کی خاطر بڑی مہارت سے مسخ کرنا، اپنی شریر سوچ اور بے ہنگم حرکتوں کو بھولے بھالے کرداروں کے سر منڈھ دینا، اردو کی شعری کائنات اور اس کے رچاؤ کو بڑی شدت سے اپنی تحریروں کا حصہ بنانا، بعض مضحک کرداروں کے نام میں صرف ثقالت پیدا کرنے کے لیے 'ق'، 'غ' اور 'ذ' کا بہ کثرت استعمال کرنا... یوسفی کے فن کے امتیازی نقوش ٹھہرے!

اردو ادب کے اکابرین نے ہمیں لکھنؤ، دلی اور حیدرآباد سے روشناس کرایا تھا۔ یوسفی ہمیں بے پوری سیر کراتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ راجستھانی فنون لطیفہ کا سارا حسن ان کی تحریروں میں سمٹ آیا ہے۔

بہ قول شخصے یوسفی اردو ادب کے مسکراتے ہوئے فلسفی ہیں... اور انھوں نے اپنی انشائے ارجمندی سے اردو نثر کو نئی بلندیوں سے روشناس کرا دیا ہے۔

●●●

اردو دُنیا

الیکشن کمیشن میں اردو افسر کیوں نہیں؟

نئی دہلی۔ الیکشن کمیشن آف انڈیا ملک کا سب سے بااختیار ادارہ ہے بالخصوص الیکشن نوٹیفکیشن جاری ہونے کے بعد تو اس ادارے کو بہت زیادہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ ان دنوں یہ کمیشن بہت زیادہ سرگرم عمل ہے، اس کے ماتحت ریاستی الیکشن کمشنر ہوتے ہیں جو ریاست بھر کے انتخابی عمل کے نگراں ہوتے ہیں، انتخابی ضابطۂ اخلاق کے نافذ ہو جانے کے بعد تو اس محکمے کو پورا پورا قانونی اختیار مل جاتا ہے، ہر امیدوار پر نظر رکھنا ان کے یومیہ حساب و کتاب پر نگرانی رکھنا اور امیدوار کے ذریعے انتخابی تشہیر کے لیے جاری کیے گئے بینر، پوسٹر اور ہینڈ بل و پمفلٹ پر نگرانی رکھنا کہ کہیں اس پمفلٹ میں کوئی اشتعال انگیز اور نفرت پیدا کرنے والی نیز ٹکراؤ اور تصادم کا ماحول بنانے والی کوئی تحریر تو نہیں ہے، اس لیے ہر پمفلٹ کو عوام میں تقسیم سے پہلے اس کی چار کاپی الیکشن آفس میں پرنٹر و پبلشر کے ڈکلیریشن کے ساتھ جمع کرنی ہوتی ہے وہاں سے OK ہونے کے بعد اسے عوام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ڈیلنگ افسر اس ہینڈ بل کی جانچ کے بعد جب NOC دے دے گا اس کے بعد اسے عوام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے دیگر سبھی زبانوں کے ہینڈ بل اور پمفلٹ کی جانچ کے بعد اسے تقسیم کرنے کی اجازت دی جاتی ہے مگر الیکشن آفس میں اردو پڑھنے والا اور سمجھنے والا کوئی نہ ہونے کی وجہ سے امیدواروں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے ہینڈ بل دیر سے تقسیم ہوتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ الیکشن محکمے میں اردو پڑھنے والا کوئی نہیں ہے اور اس لیے اردو کے ہینڈ بل اور پمفلٹ کئی کئی دنوں بعد ملتے ہیں، ملک میں تقریباً 25 کروڑ مسلمان رہتے ہیں ان میں سے کم و بیش 18-17 کروڑ مسلمان ووٹرس ہیں انھیں کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، اتنی بڑی تعداد میں اردو داں حضرات ہونے کے باوجود بھی اگر الیکشن کمیشن اردو کا ایک بھی افسر نہ رکھے تو کیا اس عمل سے اردو کے تئیں تعصب کی بو نہیں آتی؟ کیا اردو زبان سے اس قدر نفرت ہے کہ الیکشن جیسے اہم محکمے سے بھی اردو کو دور رکھا جائے۔ ملک میں رائج 14 سرکاری زبانوں میں اردو بھی شامل ہے پھر اردو کو اپنے ہی ملک میں رسوا کیوں کیا جارہا ہے آخر اردو کے ساتھ اس قدر تعصب کا رویہ کیوں؟ آج اردو کے ہینڈ بل اور پوسٹر کو پڑھ کر اسے پاس کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کیا یہ اردو زبان کے ساتھ زیادتی نہیں؟ الیکشن کمیشن کے اس رویے پر پورے ملک کے اردو داں حضرات کو متحد ہو کر آواز اٹھانا چاہیے، یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ ملک کے کروڑوں اردو کے چاہنے والوں کا ہے۔

(اخبار نو، دہلی)

اردو امیدواروں کا تقرر جلد کرنے کا مطالبہ

ارریا، بہار (۱۰ اگست)۔ ضلع میں اردو، بنگلہ ٹی ای ٹی کامیاب امیدواروں کی تقرری میں تاخیر سے ان میں بے چینی پائی جارہی ہے اور انھوں نے حکومت بہار سے مطالبہ کیا ہے کہ جلد سے جلد ان کا تقرر کا عمل شروع کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک میٹنگ کا انعقاد آزاد اکیڈمی احاطے میں کیا گیا جس کی صدارت ضلع صدر مولانا اطہر حسین مظاہری نے کی۔ انھوں نے حکومت بہار کو متنبہ کیا کہ حکومت جلد سے جلد تقرر کو یقینی بنائے تاکہ روزگار کے لیے پریشان امیدواروں کو راحت مل سکے۔ اس نشست میں کئی ایجنڈوں پر غور و خوض کیا گیا جن میں حکومت بہار کے سرکلر کے مطابق ستمبر ۲۰۱۳ء میں امتحان، اکتوبر میں رزلٹ اور نومبر میں تقرر کا تذکرہ کیا گیا۔ امتحان اور رزلٹ تو مقررہ وقت پر ہوئے مگر تقرر میں تاخیر ہورہی ہے۔ تقرر کے نام پر صرف ٹال مٹول کی جارہی ہے۔ ۲۹ نومبر ۲۰۱۳ء کو اس وقت کے محکمہ تعلیم کے سکریٹری امرجیت سنہا نے سرکاری اشتہار کے ذریعے کامیاب امیدواروں کو خوش خبری دی تھی کہ بحالی دسمبر ۲۰۱۳ء تک مکمل کردی جائے گی مگر آٹھ ماہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس پر عمل نہ ہوسکا، حکومت اور محکمہ تعلیم کے اس رویے سے کامیاب امیدواروں میں سخت ناراضگی ہے۔ میٹنگ میں حکومت سے آل بہار اردو بنگلہ اسپیشل ٹی ای ٹی کامیاب امیدواروں کی جلد سے جلد تقرر کے عمل کو شروع کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا، اگر اسے نہیں کیا گیا تو اس کے خلاف تحریک شروع کی جائے گی۔ اس نشست میں تنظیم کے ریاستی صدر عبدالباقی (پٹنہ) نے بھی شرکت کی۔ میٹنگ میں عہدیداران کے علاوہ بڑی تعداد میں امیدواروں نے شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

دہلی میں 12 ہزار اساتذہ کی تقرری ہوگی

نئی دہلی (۱۳ اگست)۔ راجیہ سبھا میں آج وقفہ سوالات کے دوران ریاستی وزیر داخلہ کرن رجیجو نے بتایا کہ اکتوبر میں 2,375 پی جی ٹی اساتذہ کے لیے آن لائن درخواست مدعو کی جائے گی اور دسمبر تک ان کی تقرری کا عمل مکمل کرلیا جائے گا۔ جنوری ۲۰۱۵ء میں 9,439 ٹی جی ٹی اساتذہ کی درخواست مدعو کرکے مارچ تک ان کی تقرری مکمل کرلی جائے گی۔ انھوں نے کانگریس کے رکن راجیہ سبھا پرویز ہاشمی کے سپلیمنٹری سوال کے جواب میں بتایا کہ ۱۹ جولائی ۲۰۱۴ء تک ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کے تحت اسکولوں میں پی جی ٹی کے منظور شدہ عہدے 10,850 ہیں جس میں سے 2,375 عہدے خالی ہیں۔ ٹی جی ٹی (انگریزی) کے 29,448 منظور عہدوں میں سے 9439 عہدے خالی ہیں۔ ٹی جی ٹی (مشترکہ) کے 17215 منظور عہدوں میں سے 7733 عہدے خالی ہیں۔ وزیر موصوف نے بتایا کہ براہ راست بھرتی کوٹے کے تحت ان خالی عہدوں کو بھرنے کے لیے دہلی کے ماتحت سروس سلیکشن بورڈ کو خط بھیج دیا گیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ساگر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے اساتذہ کو برطرف کیے جانے کا معاملہ

نئی دہلی (۱۳ اگست)۔ ڈاکٹر ہری گور سنگھ ساگر یونیورسٹی میں اردو اساتذہ کو برطرف کیے جانے پر اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ابن کنول نے کہا ہے کہ اردو کے فروغ میں ریاست مدھیہ پردیش نے گزشتہ دہائیوں میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے، انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مدھیہ پردیش کی مرکزی یونیورسٹی میں اردو کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تقریباً 25 سال بعد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر نے اس طرف توجہ دی کہ شعبۂ اردو میں اساتذہ کی تقرری ہوئی اور جن اساتذہ کی تقرری ہوئی انھوں نے اپنی ذاتی محنت اور لگن سے شعبے کے موجودہ تعلیمی سال میں متعدد طلبہ کا داخلہ کرایا۔ مختلف علاقوں پر دور دراز سے طالب علموں نے آکر یہاں داخلہ لیا اور اب کارگزار وائس چانسلر نے اپنی تنگ نظری کے باعث شعبۂ اردو کے چاروں اساتذہ کو یونیورسٹی سے علاحدہ کردیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ عمل تقرر ہونے کے تقریباً 15 مہینے بعد کیا گیا۔ بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ اردو شعبے کو بند کرنے کی ایک بڑی سازش ہے۔ ہم اردو والوں کو اگر اپنی زبان سے محبت ہے تو ان اساتذہ کی بحالی کے لیے کوشش کرنی چاہیے اور موجودہ وائس چانسلر کی اس حرکت کی بھرپور مذمت کرنی چاہیے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی اسکول آف لنگویجز کے ڈین پروفیسر اسلم اصلاحی نے کہا کہ اساتذہ کی برطرفی افسوسناک ہے۔ اس سے تعلیم کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ یونیورسٹی انتظامیہ کو اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنی چاہیے۔ معروف فکشن نگار مشرف عالم ذوقی نے اردو اساتذہ کو معزول کیے جانے پر خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ حکومت کے اندر ایسے واقعات پیش آرہے ہیں جو بہت خطرناک ہیں۔

(انقلاب، دہلی)

تلنگانہ کے کلکٹریٹ دفاتر میں اردو سیل کے قیام کا مطالبہ

حیدرآباد (۸ اگست)۔ اسٹیٹ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن تلنگانہ (سوٹا) کے قائدین محمد عبدالنعیم، محمد انوار الباقی، محمد عبدالجبار افروز، محمد عبدالقدیر صدیقی، محمد خواجہ معین الدین، ساجد محی الدین، نورالدین قادری اور خواجہ فاروق الدین واجد نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ تلنگانہ کے تمام اضلاع میں ضلع کلکٹریٹ حیدرآباد کی طرز پر اردو سیل کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ اردو زبان کے مسائل، اردو درخواستوں کی وصولی اور اقلیتوں کے دیگر مسائل کو اردو سیل سے رجوع کرنے پر کلکٹر ان مسائل کو آسانی سے حل کرسکیں۔

(سیاست، حیدرآباد)

قلعہ گولکنڈہ کی تاریخی تختیاں تلگو، انگریزی اور ہندی میں نصب
مگر اردو نظر انداز

حیدرآباد (۸ اگست)۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے مگر آزادی کے بعد اس زبان سے تعصب پسندی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک بدستور جاری ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ قلعہ گولکنڈہ جو تلنگانہ کے پہلے چیف منسٹر کے سی آر کی جانب سے یوم آزادی تقریب منانے کے اعلان کے بعد سرخیوں میں ہے۔ گولکنڈہ کی تاریخی تختیاں صرف تلگو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں نصب کی گئی ہیں جو محکمہ آثار قدیمہ کے عہدیداروں کا لسانی تعصب اور اردو دشمنی کی عکاسی کرتا ہے حالاں کہ حیدرآباد ملک بھر میں اردو کا دارالحکومت سمجھا جاتا ہے۔ حکومت نے اس زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ سب سے زیادہ اردو اخبارات و رسائل حیدرآباد سے شائع ہوتے ہیں لیکن اسے تعصب اور اردو دشمنی نہیں تو اور کیا کہا جائے کہ متعلقہ عہدیداروں نے قلعہ گولکنڈہ کی تاریخی حیثیت اور اس کی داستان کو صرف تلگو، انگریزی اور ہندی میں تحریر کیا ہے جب کہ اردو کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لسانی کمیشن اور حکومت اس تعصب پسندی کا سخت نوٹ لے اور محکمہ آثار قدیمہ کو فوری طور پر اس بات کا پابند بنائے کہ وہ قلعہ گولکنڈہ کی تاریخی تختی کو اردو زبان میں بھی نصب کرے۔

(سیاست، حیدرآباد)

☆☆☆

افسانہ و ناول نگاروں سے درخواست

اردو میں ناول اور افسانے کے اب تک ہزاروں مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے ناموں کی مختصر طور پر کئی فہرستیں متفرق رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ کچھ محققین نے اس اہم کام کو کتابی شکل میں بھی پیش کیا ہے۔ لیکن یہ سارا تحقیقی کام بہت محدود پیمانے پر ہوا ہے اور اس ضمن میں اب تک کوئی بڑی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہزاروں مجموعے گمنامی میں دفن ہیں۔ اس اہم ضرورت کے پیش نظر راقم نے 1947 تا حال ہندوستان میں شائع ہونے والے ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں کا ایک مکمل اشاریہ ترتیب دینے کا تہیہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں سیکڑوں رسائل، متعدد اشاریوں، مختلف کتابوں اور دیگر متفرق وسائل سے اب تک کئی ہزار ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں سے متعلق ضروری معلومات یکجا کر لی گئی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اپنے ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں کے بارے میں ضروری معلومات جلد از جلد عنایت فرمائیں۔ اس اشاریے کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا، جس سے افسانوی ادب اور فکشن کے اسکالرز اور محققین کو یقیناً فائدہ ہوگا۔ آپ یہ معلومات ایس۔ ایم۔ ایس یا ای میل سے بھیج سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ موبائل سے بھی نوٹ کرا سکتے ہیں یا پھر پوسٹ کارڈ پر لکھ کر یا لفافے میں رکھ کر رجسٹرڈ ڈاک سے بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ آپ کو جو معلومات دینی ہیں وہ اس طرح ہیں:

۱- ناول یا افسانوی مجموعے کا نام
۲- مصنف کا نام
۳- سال اشاعت

(ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں)

Dr. Mohd. Athar Masood Khan
Ghaus Manzil, Taleb Mulla Iram
Rampur-244901 UP
Mob.No.09719316703
faiztanveer708@yahoo.com

اردو اسکولوں کو کنڑا یا انگریزی اسکولوں میں ضم کرنے کے متعلق کرناٹکا کا ردِ عمل

گلبرگہ، کرناٹک (۲۹ جولائی)۔ کرناٹکا کے صوبائی صدر شیخ فیاض الدین نے ایک اخباری بیان جاری کرتے ہوئے کہا ہے کہ آزادی سے قبل اردو ہندوستان کی معروف زبان تھی، مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی اردو زبان کی درس و تدریس میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جب لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل ہوئی تو اردو کو کسی بھی ریاست میں سرکاری زبان کا درجہ مل نہ سکا۔ کسی بھی زبان کے تحفظ کی دستوری ضمانت کے باوجود ریاست کرناٹک میں اردو زبان کے تحفظ اور اس کے فروغ کے ٹھوس عملی فیصلے نہیں ہوئے۔ کرناٹک میں 16 فیصد مسلمانوں کے ہوتے ہوئے بھی اردو کو روزی روٹی سے جوڑا نہ جا سکا۔

ریاست کرناٹک میں 90 لاکھ اردو والوں کی آبادی کی بہ نسبت 11500 اردو اسکولس ہونے چاہیے تھے مگر 2005 میں اردو اسکولوں کی تعداد 5500 اور ان اسکولوں میں تدریسی عملے کی تعداد 24 ہزار تھی جو اب گھٹ کر 4500 اردو اسکولس اور 20 ہزار اساتذہ کی ہو گئی ہے اور مزید یہ کہ ہر ضلعے میں بیسیوں ایسے اسکول ہیں جو طلبہ کی مطلوبہ تعداد نہ ہونے کی وجہ سے بند ہونے کے دہانے پر ہیں۔ حال ہی میں محکمۂ تعلیمات کے کمشنر جناب محمد محسن نے واضح کیا تھا کہ 11 ہزار پرائمری اساتذہ کا تقرر ہو رہا ہے جس میں صرف 500 اردو اساتذہ کی منظوری ہے۔ مذکورہ رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست میں 70 فیصد مسلم طلبہ غیر اردو اسکولوں میں داخلہ لے رہے ہیں اور جو 30 فیصد طلبہ اردو اسکولوں میں داخلہ لے رہے ہیں پانچویں اور ساتویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ان میں سے 40 فیصد طلبہ ڈراپ ہو جاتے ہیں تو اندازہ لگایئے کہ کتنے فیصد طلبہ اردو تعلیم سے جڑے ہیں اور مستقبل میں اردو کا کیا مقام رہے گا۔ کیا یہ ہمارا فرض نہیں بنتا کہ ان طلبہ کو بھی ہم اردو تدریس کے دائرے میں لائیں؟ (سالار۔ بنگلور)

اردو مدارس کی بقا کے لیے اساتذہ کا تقرر ضروری

نارائن پیٹ، تلنگانہ (۳۰ اگست)۔ ریاست میں اردو اساتذہ کی تقرری سرکاری مدارس میں نہ ہونے کی وجہ سے کئی مدارس بند ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو مدارس کو بچانے کے لیے فی الفور اردو اساتذہ کی تقرری عمل میں لائی چاہیے۔ جناب رؤف حسام الدین سکریٹری سوتا نے نارائن پیٹ میں اخباری نمائندوں سے بات کرتے ہوئے

ضلع پریشد ہائی اسکول کوتگیر اور پوتنگل (اردو میڈیم) میں اساتذہ کا تقرر کیا جائے

نظام آباد، تلنگانہ (۲۸ اگست)۔ آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس اسوسی ایشن نظام آباد یونٹ کے صدر جناب محمد اسحاق حسین نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ضلع پریشد ہائی اسکول کوتگیر میں اردو میڈیم کا متوازی سیکشن قائم ہوئے 25 سال کا عرصہ گزر گیا لیکن افسوس کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک مضمون سماجی علم اور مضمون تلگو کا پوسٹ منظور نہیں ہوا۔ پوتنگل ہائی اسکول میں بھی مضمون سماجی علم اور مضمون تلگو کا پوسٹ منظور نہیں ہے اور اردو کا پوسٹ جو حالیہ عرصے میں خالی ہوا ہے اس پر بھی ابھی تک تقرر نہیں کیا گیا۔ سلیمان فارم میں 240 طلبہ کے لیے صرف تین ایس جی ٹی ٹیچرس ہیں جب کہ ضلع پریشد ہائی اسکول کوتگیر میں 225 طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ دسویں جماعت میں 69 طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ پوتنگل ہائی اسکول میں 250 طلبہ زیر تعلیم ہیں اور دسویں جماعت میں 71 طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ انھوں نے چیف منسٹر جناب چندر شیکھر راؤ، ڈپٹی چیف منسٹر جناب محمود علی اور جناب زاہد علی خاں سے مطالبہ

حکومت سے یہ مطالبہ کیا۔ تعلیمی سال کا آغاز ہوئے تین ماہ ہو چکے ہیں مگر کئی مدارس ایسے ہیں جہاں ایک بھی مدرس موجود نہیں ہیں۔ ان مدارس پر تا حال ودیا والینٹرس کی بھرتی بھی عمل میں نہیں لائی گئی۔ سرکاری مدارس کو باقی رکھنا ہے تو ان مدارس میں اساتذہ کی تعیناتی ضروری ہے۔ گرمائی تعطیلات کے درمیان ہی بھرتی کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ جناب رؤف حسام الدین ریاستی سکریٹری سوتا نے کہا کہ اردو میڈیم کے سرکاری مدارس میں ای ایس سی کے بعد بھی مکمل طور پر اساتذہ کی تقرری عمل میں نہیں آئی ہے کیوں کہ تقریباً نصف اسامیاں تحفظات کے سبب روسٹر سسٹم کی نذر ہو جاتی ہیں۔ باقی اسامیوں پر جو تقرر عمل میں آیا وہ بھی اعداد و شمار کے مطابق نہیں ہوئے۔ اردو والوں میں علاحدہ ریاست کی تشکیل کے بعد اردو کے فروغ و ترویج کی امید پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے حکومت اردو مدارس کے فروغ کے لیے فی الفور اردو اساتذہ کی تقرری عمل میں لائے اور جن مقامات پر اساتذہ کی تقرری نہ ہونے سے اردو مدارس بند ہو چکے ہیں ان مدارس کی دوبارہ بحالی کے اقدامات کیے جائیں۔

(سیاست۔ حیدر آباد)

کیا کہ فوری طور پر ان اسامیوں پر اسٹر گرلز کے تقرر کیے جائیں۔ ضلع نظام آباد میں جملہ 593 پوسٹ خالی ہیں۔ پرائمری اسکول میں 151، اپر پرائمری میں 263 اور ہائی اسکول میں 179 پوسٹ کو منظور کرتے ہوئے اردو میڈیم کے لیے اسپیشل ڈی ایس سی کا انعقاد عمل میں لا کر 593 پوسٹ پر تقرر کیا جائے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدر آباد)

اردو مترجمین کی تقرری میں درپیش مسائل دور

دیوبند (۱۹ اگست)۔ حکومت کے محکمۂ تعلیم کی جانب سے اردو مترجمین اور سینئر معاون کلرک کے عہدوں پر تقرری کے لیے امیدواروں کو اے سی پی ملنے میں آنے والی دشواریوں کو دور کر دیا گیا ہے۔ اے سی پی سے متعلق سرکاری حکم نامے میں چند پیچیدگیوں کی وجہ سے مذکورہ عہدوں پر فائز ہونے والوں سے متعلق اے سی پی منظور کرنے میں کچھ مشکلات درپیش تھیں۔ تفصیل کے مطابق انتظامیہ نے ۱۳ فروری ۲۰۱۳ء کو اے سی پی دیے جانے سے متعلق ایک سرکاری حکم نامہ جاری کیا تھا جس کے بعد مختلف محکموں کی جانب سے مذکورہ حکم نامے سے متعلق بعض نکات کی تفصیلات مانگی گئی تھیں، اب حکومت نے صاف کر دیا ہے کہ حکم نامے کے مطابق اردو مترجمین اور معاون سینئر کلرک کو 10 برسوں کی خدمات کے عوض پہلی اقتصادی ترقی کی شکل میں 2400 روپے کا گریڈ اسکیل دیا جائے گا۔

اسی طرح اردو مترجم معاون کلرک کو 15 برسوں کی خدمات کے صلے میں ترقی دے کر اردو مترجم اور سینئر کلرک کے عہدے پر فائز کیا جائے گا اور اس کا گریڈ اسکیل 2800 روپے مقرر کیا جائے گا۔ اس عہدے پر اس کی تنخواہ ۲۰۱۰ء کو جاری سرکاری حکم نامے کے مطابق ہوگی۔ علاوہ ازیں اردو مترجم اور سینئر معاون کلرک کے عہدے پر فائز ملازم کی ترقی دیگر ملازمین کو ملنے والی ترقی کے مساوی ہوگی اور ۵ برسوں کی خدمات کے صلے میں اسے پہلی ترقی دی جائے گی۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

سوریا پیٹ میں اردو میڈیم کالج کے قیام کی یقین دہانی

سوریا پیٹ (۳۰ اگست)۔ تلنگانہ کے وزیر تعلیم اور رکن اسمبلی سوریا پیٹ

رشید ودلے نہ از دل ما

نئی دہلی۔ معروف صحافی، دہلوی تہذیب کے نمائندہ اور روزنامہ الیوم کے ایڈیٹر محمد عتیق صدیقی کا طویل علالت کے بعد ۹ اگست کو اسکارٹس ہارٹ انسٹی ٹیوٹ اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ 70 سالہ عتیق صدیقی کو ۹ رمضان کو ہارٹ اٹیک کے بعد پہلے جی بی پنت اور پھر اسکارٹس میں داخل کرایا گیا تھا اور وہ تبھی سے یہاں زیر علاج تھے۔ ہارٹ اٹیک کے بعد ان کی کڈنی میں بھی انفیکشن ہو گیا تھا اور وہ مسلسل انتہائی نگہداشت والے وارڈ میں تھے۔ ان کی تدفین بعد نماز ظہر دہلی گیٹ قبرستان میں عمل میں آئی۔ قبل ازیں مسجد فیض الٰہی میں جامع مسجد کے شاہی امام سید احمد بخاری نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ مرحوم کی تدفین کے موقعے پر بڑی تعداد میں سیاسی، سماجی، ادبی اور صحافتی شخصیات نے شرکت کی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں ایک بیٹا اور اہلیہ شامل ہیں۔

عتیق صدیقی نے دہلی کالج سے پوسٹ گریجویٹ اور دہلی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ دہلی کی تہذیب کے دلدادہ تھے اور سماجی اور فلاحی کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انھیں اردو زبان و ادب سے بھی بے حد لگاؤ تھا اور باہر سے آنے والے ادبا اور شعرا کے اعزاز میں اکثر وہ مختلف ادبی نشستوں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

جناب جی جگدیش ریڈی نے کہا کہ ٹی آر ایس حکومت انتخابات سے کیے گئے ہر وعدے کو پورا کرنے کی پابند ہے۔ حکومت نے مسلمانوں کو ہر شعبے میں انصاف دلانے کے مقصد سے ایک جامع منصوبے کو قطعیت دی ہے۔ ٹی آر ایس سربراہ اور چیف منسٹر کے سی آر نے حسب وعدہ ایک مسلمان کو ڈپٹی چیف منسٹر بناتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ وہ جو کہتے ہیں اس پر عمل آوری بھی کرتے ہیں۔ جی جگدیش ریڈی نے یہاں پر اردو میڈیم کالج کے قیام کو ضروری قرار دیتے ہوئے بہت جلد کالج کی منظوری اور کالج عمارت کی تعمیر کے لیے بھی اقدام کرنے کا اعلان کیا۔

(رہنمائے دکن۔ حیدر آباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : چاند پر دیا (غزلیں)
شاعر : ف۔س۔ اعجاز
ضخامت : ۱۷۲صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتہ : انشا پبلی کیشنز
ذکریا اسٹریٹ، کلکتہ
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی
razakidak@gmail.com

زیر تبصرہ کتاب 'چاند پر دیا' مشہور ومعروف شاعر اور 'انشا' کے اڈیٹر ف۔س۔ اعجاز کی غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کا پہلا مجموعہ 'اونچے مکانوں کے قریب' 2005 میں منظر عام پر آکر قبولیت کی سند حاصل کر چکا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ 'چاند پر دیا' ہے جس میں 1990 کے بعد کی غزلوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس میں تمہید اور مضمون نئی غزل اور سماجی حقیقت نگاری کے علاوہ ایک حمد اور ایک منقبت کے علاوہ 128 غزلیں شامل ہیں، آخر میں چند دوہے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ غزل کا مزاج ہمیشہ سے ہی نرم و نازک اور شگفتہ رہا ہے لیکن ہر دور میں کچھ شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے خلاف توقع شاعری کی اور اپنی فکری پختگی، نئی رچاؤ اور زمانے کی عام روش سے الگ شعری آہنگ میں جو لوگ اپنی بات بڑی کامیابی سے پہنچا رہے ہیں ان میں ایک نام ف۔س۔ اعجاز کا ہے، وہ مشہور ومعروف مدیر ہیں لیکن کا ہے بگا ہے اپنے جذبات واحساسات کو بھی عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ 'چاند پر دیا' کی غزلوں کا مطالعہ کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ذہن ودل کی کشمکش میں مبتلا ہے اور آخر میں اس کی شاعری پر اس کا ذہن غالب آتا ہے جس کا احساس ان کے زیادہ تر اشعار میں ہوتا ہے، ملاحظہ ہوں چند منتخب اشعار:

ایک جیسے چہرے ہیں ایک جیسی قمیص
بھیڑ میں سب سے الگ اک فرد ہونا چاہیے

سوچ جب ہو تو کیا فرد بول سکتا ہے
کسی کے کان کے پڑدے بھی کھول سکتا ہے
وہ اپنی پیاس کے اسرار جاننے کے لیے
اندھیرا ہو تو بدن کو ٹٹول سکتا ہے

مفت میں بیچتے ہیں ہم خوں کسی محنت کش کا
اپنے بیٹوں کی فیس پہ نہیں ہوگا ہم سے

نصیب میں جو لکھے تھے وہ غم سمیٹ لیے
نظر نے سوچوں کے سب پیچ و خم سمیٹ لیے

غزل کے نرم و نازک مزاج کو تبدیل کرنے میں وہ پیش پیش نظر آتے ہیں اس بات کا ذکر وہ اپنی غزلوں میں بار بار کرتے ہیں اور یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ غزل کے اس نئے پیکر کو تسلیم کیا جائے، وہ بار بار قاری کے ذہنوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی غزلوں میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں، ان کے زیادہ تر اشعار اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار:

غزل تلاش میں ہے جس حسین پیکر کی
اسے میں سایۂ مہتاب سے نکالوں گا
بہت دنوں سے ہے تو قید نرم کپڑوں میں
تجھے میں اطلس و کمخواب سے نکالوں گا

بغیر غم بغیر عشق شاعری سے کیا غرض
تنگ نہ ہو تو بھر ہو زندگی سے کیا غرض

غزل تمھاری اگر زیور مرصع ہو
تو قافیہ بھی جھجھکے سے کم تو کیا ہوگا

صبح کا اخبار لے کر شام کو آیا ہے وہ
گھر میں باسی پیار لے کر شام کو آیا ہے وہ

'چاند پر دیا' میں شاعر ف۔س۔ اعجاز کی غزلوں کے مطالعے سے طرح طرح کے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے، وہ غزل کو بکھراں بنانے پر آمادہ ہیں۔ ان کے فکر و خیال کی لہروں کا اندازہ ان کی غزلوں کے مطالعے سے ہوگا۔ غزل گوئی میں پختگی، زندگی کے نشیب و فراز، برمحل لفظوں کا مناسب استعمال ان کی غزلوں کے حسن میں چار چاند لگانے کا کام کرتے ہیں۔ شاعری کو دل لگی کے بجائے وہ ذہنوں کو جھنجھوڑنے کا جس طرح سے کام لیتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ امید کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی ستائش بھی کی جائے گی اور ایسی شاعری کو عام بھی کیا جائے گا۔ کتاب اپنے باطنی سرمایے کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے۔

●●●

نام کتاب : میری زندگی۔شکیل بدایونی (خودنوشت)
مرتبین: رضیہ شکیل اور یوسف حسین قادری
ضخامت : ۱۶۵صفحات
قیمت : درج نہیں
ملنے کا پتہ : بک ریڈرز کلب و دبستان بدایوں
پاکستان اسلامک فورم، پاکستان
ہاؤس 3/83-A، بلاک 6،
ناظم آباد، کراچی
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

۱۹۶۹ء کے آس پاس اردو کے مشہور غزل گو شاعر اور نغمہ نگار شکیل بدایونی نے بستر علالت پر موت کی آہٹ سنتے ہی اپنی سوانح حیات قلم بندی کرا کے شائع کروا دیئے۔ خوش قسمتی سے کراچی میں مقیم ان کی بیٹی رضیہ شکیل ممبئی کے سفر کے دوران اس سوانح کا مسودہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ یہ سوانح قسطوں میں مجلہ بدایوں کراچی کے ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۶ء کے شماروں میں شائع ہوتی رہی اور اب معروف ادیب تسلیم غوری بدایونی کی فرمائش پر رضیہ شکیل اور یوسف حسین قادری کے توسط سے شکیل صاحب کی صد سالہ یوم پیدائش پر ہمارے سامنے کتابی صورت میں آچکی ہے۔

جیسا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اردو ادیبوں کی خودنوشت زیادہ تر ان کے سفر، ادبی کارناموں، نظریاتی تصادم، ہم عصر شعرا اور ادیبوں سے معاملات پر محیط ہوتی ہے لیکن شکیل کی زیر نظر سوانح جہاں ان کی حیات کی ہائی لائٹس پیش کرتی ہے، وہیں ان کے ماحول اور ملک کی اس وقت کی حالت پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ یہ مختصر سوانح غیر ضروری واقعات اور ذاتی معرکات سے منزہ ہے۔ زبان سلیس اور رواں ہے۔ قاری کو کہیں بھی کوئی بوجھل پن یا بوریت محسوس نہیں ہوتی۔

سوانح چار ادوار میں تقسیم کی گئی ہے دور اول بدایوں (۱۹۱۶ء تا ۱۹۳۶ء)، دور دوم (علی گڑھ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۱ء)، دور سوئم (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۶ء) اور دور چہارم ممبئی (۱۹۴۶ء تا ۱۹۶۹ء)۔ دور اول میں شکیل بدایونی نے اپنے بچپن کی یادوں کو قرطاس کے حوالے کر دیا ہے۔ ۳ اگست ۱۹۱۶ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ سنہ ہجری کے حساب سے نام غفار احمد ہونا چاہیے تھا مگر شکیل احمد نام رکھا گیا۔ والد کا نام مولوی جمیل احمد قادری سوختہ تھا، جو تخلص نہیں بلکہ موروثی لقب تھا۔ وہ ممبئی میں قوجہ سنی مسجد کے خطیب تھے۔ اس فصل میں شکیل بدایونی نے بدایوں کے رسم و رواج، مذہبی بھائی چارے، اپنے شجرۂ نسب، خاندانی عقیدے، بچپن کے کچھ دلچسپ واقعات، مکتب، شکیل کو وہ نام تک اور

نظموں سے رغبت، شاعری کی شروعات اور اولیائے کرام سے عقیدت پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول شکیل بدایوں کو اولیاء اللہ کا مسکن ہونے کے سبب 'مدینۃ الاولیا' بھی کہا جاتا ہے۔ شکیل بدایونی نے ایسی کئی مثالیں دی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدایوں میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے تھے مگر پہلی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کی سوچی سمجھی چال کے تحت ان دو فرقوں کے درمیان نفرت بوئی گئی جو دو قومی نظریے کی صورت میں رونما ہو کر آخر کار ملک کے بٹوارے اور خونریزی پر انجام پذیر ہوئی۔

شکیل کو شعر گوئی کی خداداد صلاحیت تھی۔ چوں کہ ان کے استاد نعت و منقبت کے شاعر تھے اس لیے شکیل نے ان سے کنارہ کشی کرلی۔ انھوں نے اس عام خیال کو بھی مسترد کیا ہے کہ وہ جگر مرادآبادی کے شاگرد تھے۔ بچپن میں بدایوں کے ادبی ماحول اور مشاعروں کے بارے میں اس سوانح میں بھرپور جانکاری ملتی ہے۔ ان شعرا کے نام بھی درج کیے گئے ہیں جو ان محفلوں کی زینت ہوا کرتے تھے۔ شکیل بدایونی نے خود اسکول میں نظموں سے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی مگر بعد میں غزلوں کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے کئی تخلص اپنائے جیسے 'صبا'، 'فروغ' اور آخر میں 'شکیل'۔ مصنف نے کئی ایسے واقعات بیان کیے ہیں جب انھوں نے اپنی مترنم آواز کے سبب مشاعرے لوٹ لیے اور سامعین ان کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے تاب ہوتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں نشان ہند ممبئی میں ان کی پہلی غزل چھپی تھی۔

۱۹۳۶ء میں شکیل بدایونی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر والد کی اچانک موت کی وجہ سے انٹر کے بعد ہی ممبئی جانا پڑا جہاں ان کے خسر نے ان کو پولیس میں نوکری کرنے کی صلاح دی لیکن جگر مرادآبادی کے مشورے پر ارادہ بدل دیا۔ نتیجتاً شکیل نے ممبئی ہی میں ۱۹۳۷ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے علی گڑھ کی تعلیم، طلبہ کی شرارتوں، ادبی ماحول، ہم عصر شعرا اور بڑھتے ہوئے سیاسی تناؤ، اردو ادب میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے نظریاتی تصادم اور غزل اور نظم کی معرکہ آرائی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ جگر مرادآبادی کا انھوں نے خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ علی گڑھ میں انھیں نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی شعرا کے کلام سے بھی آشنائی ہوئی۔ اس دور میں انھوں نے کئی مشاعروں مثلاً آگرہ، اجمیر، شاہجہاں پور، بریلی، الہ آباد، خورجہ، متھرا وغیرہ میں شمولیت کی اور اپنی سوانح میں ان مشاعروں کے دستور اور ان

کی مختصر جھلکیاں بھی بیان کی ہیں۔ بی اے کے بعد شکیل بدایونی نے اپنے دوست یوسف حسین قادری کے مشورے پر دلی میں سپلائی ڈپارٹمنٹ میں ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پر ملازمت کی اور یہاں چار سال تک قیام کیا۔ دور سوئم (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۶ء) میں شکیل بدایونی دہلی کے ادبی ماحول سے روبرو ہوئے جہاں ان کی خواجہ حسن نظامی اور کئی نامور مسلم شعرا کے علاوہ بیسیوں غیر مسلم شعرا سے ملاقات ہوئی۔ توازن پسندی کے باعث وہ نہ تو ترقی پسندوں کے ہمنوا بن سکے اور نہ ہی جدیدیوں کے۔ دہلی ہی میں ان کو کئی روحانی واقعات کا تجربہ ہوا۔ یہی وہ دور تھا جب سیاست بھی بہت گرما چکی تھی اور حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ دہلی ان سازشوں کا منبع تھی، اس لیے شکیل بدایونی نے حکیم مرزا حیدر بیگ کے اصرار پر ممبئی کی راہ لی جہاں بسر کی ہوئی زندگی کو انھوں نے دور چہارم (۱۹۴۶ء تا ۱۹۶۹ء) کے تحت بیان کیا ہے۔ ممبئی میں وہ فلموں کے ساتھ جڑ گئے اور کئی مشہور فلمی گیت قلم بند کیے جو آج بھی مقبول ہیں۔ یہاں پر ان کی ملاقات نہ صرف نامور فلمی ہستیوں بلکہ صحافیوں، شاعروں اور دیگر ادبی شخصیتوں سے بھی ہوئی جن کا ذکر انھوں نے اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے اس دور کے مشاعروں اور اپنی مقبولیت پر بھی تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ سوانح میں انھوں نے اپنے مذہبی عقائد اور سفر عراق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ فلمی دنیا پر انھوں نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس چکاچوند دنیا میں فلمی اداکاروں اور فنکاروں کی کیا حالت ہوتی ہے اور فلمی شاعری عام شاعری سے کیوں مختلف ہے۔ شکیل نے حاصل کیے ہوئے فلمی اور ادبی اعزازات کا بھی ذکر کیا ہے۔ شکیل بدایونی کے مجموعہ کلام 'رعنائیاں'، 'صنم و حرم'، 'نغمۂ فردوس' (نعتیہ کلام)، 'رنگینیاں'، 'شبستان'، 'دور کوئی گائے' اور 'کلیات شکیل' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں سے چند مجموعے ہندی میں بھی چھپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ شکیل الرحمٰن نے ان کی شاعری کے حوالے سے 'شکیل بدایونی کی رومانی شاعری' شائع کی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں بستر سے ان کی پیٹھ لگ گئی اور آخر کار ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ اسی دوران میں شکیل نے اپنی سوانح حیات رقم کی جس کی آخری قسط ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو لکھی گئی۔

میری نظر میں شکیل بدایونی کی زیر نظر خودنوشت سوانح نہ صرف ان کی زندگی کی آئینہ دار ہے بلکہ اس وقت کے ادبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی ماحول کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ ●●

بقیہ: ہندستانی ذہن وتہذیب...

صفحہ ۲ سے آگے

یہ رسسائی پلک کی گھنی گھنی پرچھائیں

اور ساتھ میں یہ بھی:

ندی کے بیچ کمدنی کے پھول کھل اٹھے
نہ مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دنیا

اسی طرح سے ان کی نظموں 'داستان آدم'، 'دھرتی کی کروٹ'، 'ہنڈولہ' وغیرہ میں ہندستانی زبان، مشترکہ تہذیب کے ساتھ مظاہر دھڑکتے نظر آتے ہیں۔ رباعیوں میں گھر آنگن ہوتا ہے، بڑے رسسے انداز میں ماں، بیوی، محبوبہ، عام ہندستانی عورت کی شکل میں بات کرتی دکھائی دیتا ہے:

کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری
ہلتی ہے سڈول بانہہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ آنکھوں میں رس ہاتھوں میں
بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری

دھوبن کے ابھرت سا کھیلا ہے وہ روپ
برکھا رت کی طرح رسیلا ہے وہ روپ
رادھا کی جھپک کرشن کی بزدوری ہے
گوکل نگری کی راس لیلا ہے وہ روپ

چوکے کی سہانی آنچ، مکھڑا روشن
ہے گھر کی لکشمی پکاتی بھوجن
دیتے ہیں کرچھی کے چلنے کا پتہ
سیتا کی رسوئی کے کھنکتے برتن

رباعیاں اور بھی ہیں جو ایک بہترین ہندستانی عورت کو پیش کرتی ہیں جو محض ناز و انداز والا معشوق نہیں ہے بلکہ ایک عام عورت ہے۔ بیوی ہے ماں ہے۔ حسن کا یہ ہندستانی تصور فراق کی اپنی دین ہے فراق کی عشقیہ شاعری میں عورت کا جو روپ نظر آتا ہے وہ بھی صرف روایتی محبوبہ کا روپ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے بھی عورت کا وہ دیو مالائی تصور ہے جسے ہندو کلچر نے پیش کیا ہے۔ اس کا عورت پن، اس کی تہذیب خالص ہندستانی ہے جس میں اس کے سنگار کے سارے عمل بھی ہندستانی ہیں جو اکثر سنسکرت شاعری سے لیے گئے ہیں، اس لیے، یہ بات اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ فراق کا محبوب، فراق کا عشق، فراق کی مکمل شاعری بھرپور ہندستانیت سے مملو ہے اور یہ ہندستانیت محض رسمی و ظاہری نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک سوچا سمجھا جذبہ اور نظریہ ہے۔ فراق نے ساتھ ہی اسے ہندی اور عام ہندستانی لفظیات میں کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ فکر و لفظ باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں اور الفاظ کی ایک نرالی اور نئی دنیا نظر آنے لگتی ہے۔ راگ۔ سہاگ۔ جل ترنگ۔ سنگار۔ پریم۔ پریتم۔ نین۔ بجوگ، رجھوگ، بان۔ جیون وغیرہ فراق نے سوچے سمجھے انداز میں استعمال کیا ہے جس سے ان کی ہندستانیت مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔

ہند۔ ایرانی کلچر، جدید شاعری کا امتزاج، ہندی شاعری کے اثرات اور ہندستانی تہذیب کے آثار و علائم پہلی بار پورے رچ دھج کے ساتھ فراق کی شاعری میں کچھ اس انداز سے نظر آتے کہ فراق کی شاعری ہندستانی تہذیب کا کل نقش بن گئی اور یہ بھی کہ ہندستان صرف ایک ملک و جغرافیہ نہیں بلکہ ہندستان ایک فلسفہ، تہذیب اور طرز معاشرت کا بھی نام ہے جسے فراق نے رنگارنگ طریقے سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ فراق نے ہی ایک بار راقم الحروف سے کہا تھا کہ تہذیب، دوستی اور وطن پرستی کے مختلف آثار ہوا کرتے ہیں اس کے لیے یہ تو ضروری ہے ہی کہ آپ وطن میں رہتے ہوں اس سے زیادہ یہ ضروری ہے کہ وطن بھی آپ کے اندر رہتا ہو۔ فراق نے ہندستانیت کی پوجا کی ہے اپنی سانسوں میں دھڑکنوں میں جیا ہے۔ میں یہ بات فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ انسانی اور ہندستانی تہذیب سے بے پناہ پیار و عقیدت رکھنے والے اس البیلے شاعر کو ہم نے دیکھا سمجھا ہے کوئی رشک کرے یا نہ کرے:

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو
جب ان کو یہ دھیان آئے گا تم نے فراق کو دیکھا تھا

□□□

بقیہ: ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان...

صفحہ ۸ سے آگے

ور پیش ہے۔

آج ہر کوئی اپنے ذرائع و وسائل سے اوپر اٹھ کر اپنے بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر یا آئی اے ایس آفیسر بنانا چاہتے ہیں، اس لیے، وہ اپنے بچوں کو اردو کے بجائے انگریزی پڑھانا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں اور جو لوگ اپنے بچوں کو اردو پڑھانا چاہتے بھی ہیں تو انھیں اسکولوں میں اردو کی معیاری تعلیم اور اساتذہ کی کمی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کا دور ہے اس لیے، اردو والے خود ہی کم مائیگی اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔ وہ اردو پڑھ کر مطمئن نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہت سے اردو والوں کے بچے اردو سے نابلد ہیں۔ انگلش میڈیم اسکولوں میں اردو نہیں پڑھائی جاتی اور جہاں کہیں پڑھائی بھی جاتی ہے وہاں تلفظ اور املا کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ہندی اور اردو کی آپسی مسابقت، سیاسی تعصب اور مقامی ادیبوں کی علاقائی عصبیت نے بھی اردو کو زک پہنچایا ہے۔ ریونیو ریکارڈ میں اردو کا استعمال تو خیر اب بھی جاری ہے مگر جس طرح کی تحریر میں یہ کاغذات بنائے جاتے ہیں وہ پٹواری اور عدالت کے چند ملازموں کے سوا کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔

پروفیشنل کورسز کی تعلیم کے دوران عموماً طالب علم کسی مخصوص اسٹریم کو اپناتے ہیں۔ اکثر و بیشتر طالب علم انجینئرنگ، ڈاکٹری، کامرس یا پھر دیگر پیشہ وارانہ کورسز کی طرف مائل ہوتے ہیں، ان کورسز کے لیے ہمارے ہاں اردو کے ذریعے تعلیم دینے کے معقول انتظامات نہیں ہیں۔ نہ ہی اردو میں ترجمہ کی گئی کتابیں ہیں اور نہ اردو میڈیم کے ذریعے پڑھانے والے استاد دستیاب ہیں۔ چناں چہ اس مسابقتی دنیا میں ہر کوئی دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ ہمیں نہ صرف اردو کے ذریعے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم دینے کے مواقع فراہم کرنے پڑیں گے بلکہ اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ اردو کے ذریعے تعلیم پائے ہوئے نوکری کے خواہاں امیدواروں کے ساتھ کسی قسم کا بھید بھاؤ نہ ہو۔

اردو کے روشن مستقبل کے لیے ریاست میں اردو اکادمی کا قائم ہونا بھی ضروری ہے جس کی شاخیں ہر ضلع میں ہونی چاہئیں نیز انگریزی و دیگر زبانوں سے ترجمہ کرنے کے لیے ایک دارالترجمہ کا قیام بھی عمل میں لانا چاہیے، جن سے اردو کی ترقی و ترویج کی رفتار تیز ہوگی۔

ماخذ:

- کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ) از پروفیسر عبدالقادر سروری۔
- جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما از ڈاکٹر برج پریمی۔
- جموں وکشمیر میں اردو زبان (ماضی، حال، مستقبل) مرتب پروفیسر شہاب عنایت ملک۔

●●●

دوسری اور آخری قسط

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کی اہمیت اور مستقبل

ڈاکٹر دلجیت ورما (ایسوسی ایٹ پروفیسر وومنز کالج، گاندھی نگر، جموں [جموں و کشمیر])

اہمیت

ریاست میں اردو زبان کی اہمیت اور مقبولیت کی چند بنیادی وجوہ حسب ذیل ہیں:

ریاست میں اردو کو خصوصی وجہ حاصل ہے۔ ایک طرف یہ رابطے کی زبان ہے اور دوسری جانب اسے سرکاری زبان ہونے کا فخر حاصل ہے۔

دور حاضر میں اردو اپنی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے ساری دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے الیکٹرانک میڈیا میں ایک اہم ذریعۂ اظہار بنی ہے جس سے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

دنیا کی تینتیس ہزار (33000) زبانوں میں تیسرے مقام پر آنے والی اور ساٹھ ممالک میں بولی جانے والی زبان اردو کوئی غیر ملکی زبان نہیں بلکہ یہ ہندوستان کی زبان ہے۔

اس زبان میں بڑی وسعت ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ کافی ہے۔ نئے نئے الفاظ وضع کرنے کی اس میں کافی صلاحیت موجود ہے۔ یہ زبان عام فہم ہے اور آسان ہونے کے علاوہ گنجلک قواعد کی تمام تر پیچیدگیوں سے آزاد ہے۔ ہر فکر و عمل کو یہ حسن و خوبی اپنے قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہماری ریاست کو ہی یہ امتیاز حاصل ہے کہ ریاستی آئین کی رو سے اردو زبان یہاں کی سرکاری زبان قرار دی گئی۔ ریاست جموں و کشمیر سے جتنی کثیر تعداد میں اردو زبان کے اخبارات و رسائل چھپتے ہیں اتنے کسی دوسری زبان میں نہیں چھپتے۔

ہند ایرانی مشترکہ تہذیب اور تمدن کا جتنا شاندار ذخیرہ اردو میں موجود ہے اتنا شاید ہی کسی دوسری ہندوستانی زبان میں ملے۔ اردو ہی وہ واحد زبان ہے جو ریاست کے تینوں خطوں جموں، کشمیر اور لداخ کے مابین تہذیبی اور لسانی رابطے کا کام کرتی ہے۔ چنانچہ اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ کوئی ایسی زبان ہو جو تینوں خطوں میں رابطے کی زبان بنے کیوں کہ جموں کے لوگ کشمیری اور لداخی سے ناآشنا ہیں، کشمیر کے ڈوگری اور لداخی سے اور لداخ کے کشمیری اور ڈوگری سے۔ اتنا ہی نہیں اس زبان کی مدد سے ہم ریاست کے ثقافتی رشتوں کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست کی مختلف مقامی زبانوں کے ادب کو ریاست سے باہر روشناس کرانے کے سلسلے میں بھی زیادہ تر اردو ہی کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔

اردو زبان کو اس ریاست میں اپنے آغاز ہی سے ایک سازگار اور خوشگوار ماحول ملا، جس کی بدولت اسے پنپنے اور پھلنے پھولنے میں کسی قسم کی دقت اور دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سرکاری سرپرستی میسر ہونے کے بعد اسکولوں اور کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک اور دفتروں اور محفلوں سے لے کر سیاسی ایوانوں تک اردو کا طوطی بولنے لگا۔ ریاستی حکومت اور عوام کے روابط دہلی، پنجاب اور لاہور جیسے شہروں کے ساتھ پہلے سے ہی قائم تھے جو اردو کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس طرح سے یہاں کے عوام کی زبان میں نکھار پیدا ہوا۔ اردو کے ان مراکز سے اردو کا شستہ ذوق رکھنے والے کئی اصحاب ڈوگرہ حکمرانوں کے ہاں اور ریذیڈنسی میں تعینات ہوئے جن سے یہاں کے لوگوں کے ذوق کو مزید جلا ملی اور شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ ریاست میں اردو کو عوام تک پہنچانے اور اس سے دل چسپی پیدا کرنے کا کام راس لیلاؤں اور بھانڈوں نے اور بعد میں بمبئی کی پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے بھی انجام دیا۔ اسی طرح پہاڑی سارنگی نوازوں، قوالوں اور موسیقاروں نے بھی اردو کو ریاست کے اطراف میں پہنچایا۔ کشمیر میں سیلانیوں اور سیاحوں کے سبب بھی اس زبان کو فروغ ملا کیوں کہ یہ خطہ شروع ہی سے سیاحوں اور سیلانیوں کی آماجگاہ رہا ہے، جہاں نہ صرف حکمران اور صاحب ثروت لوگ آتے تھے بلکہ یہ سرزمین ایسے لوگوں کے لیے بھی باعث کشش رہی جو اردو کے ماحول میں پروان چڑھے ہوئے تھے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو کی ترویج و اشاعت میں مختلف تحریکوں اور سرکاری و غیر سرکاری ادبی اداروں اور انجمنوں کا بھی نمایاں کردار رہا ہے۔

مستقبل:

اردو ایک عالمگیر زبان ہے جو آج دنیا کے ساٹھ سے زائد ممالک میں بولی اور سمجھی جانے والی تیسری بڑی زبان ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اس کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اردو کا ماضی روشن رہا ہے، حال تسلی بخش ہے اور مستقبل کی صورت حال درخشندہ ہی نظر آرہی ہے اگرچہ چند دشواریوں سے بھی اسے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

سرکاری دفاتر میں اکثر و بیشتر کام انگریزی میں ہوتا ہے۔ بیوروکریسی میں اردو جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ سکریٹریٹ کا سارا کام انگریزی میں انجام دیا جا رہا ہے۔ محکمہ پولیس، محکمہ مال اور عدلیہ میں نچلی سطح پر اردو میں کام تو ہوتا ہے لیکن اعلیٰ سطح پر سارا کام انگریزی میں ہی ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان محکموں میں افسروں کی تقرری کے وقت اردو کی واقفیت لازمی نہیں رکھی جاتی۔ چنانچہ ان کی دیکھا دیکھی اب نچلی سطح پر بھی منظر بدل رہا ہے۔

جہاں تک تعلیمی نظام کا تعلق ہے دس بیس سال پہلے تک ریاست کے تعلیمی نظام میں اردو کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ابھی چند برسوں تک کشمیر کے سرکاری اسکولوں میں آٹھویں جماعت تک کے تمام مضامین اردو میڈیم میں پڑھائے جاتے تھے۔ سوشل سائنس کے مضامین کی تدریس دسویں جماعت تک اردو میڈیم میں ہی ہوتی تھی لیکن اب اول جماعت ہی سے انگریزی میں پڑھائے جانے لگے ہیں۔ انگلش میڈیم کے ان اسکولوں میں تمام مضامین کے لیے انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں شامل نصاب کی جاتی ہیں۔ لیکن بچے آپس میں انگریزی کے بجائے اردو ہی میں گفتگو کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ زبان تقریباً دو صدیوں سے اس ریاست کی سب سے اہم زبان رہی ہے۔ یہ نہ صرف ریاست کے تین خطوں اور مختلف مذہبی، نسلی اور تہذیبی اکائیوں کے درمیان ایک رابطے کی زبان ہے اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور استعمال ہونے والی زبان ہے۔ یہ عصر حاضر میں تخلیقی اور صحافتی اظہار کا سب سے اہم اور مقبول وسیلہ ہے۔ صحافت اور ماس میڈیا کے دوسرے وسائل کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اردو کو نمایاں اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اخباروں کی ایک کثیر تعداد اردو میں چھپتی ہے اور یہ اخبارات ریاست کے کونے کونے تک پہنچتے ہیں اور دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ کی جان بن گئی ہے، جس کو ایک مستقل ذریعہ بنا کر صحافت کے شعبے سے جڑے ہوئے لوگ عوام تک خبر رسانی کا کام بڑی سرعت اور دیدہ دلیری سے انجام دے رہے ہیں۔ اس کام سے ایک طرف اردو زبان کو خوب فروغ حاصل ہو رہا ہے تو دوسری طرف اس زبان کی اہمیت اور افادیت کا یہاں کے عوام کو بہ خوبی احساس ہو رہا ہے۔ اس وقت ریاست کے مختلف اضلاع سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کی تعداد سو سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔

غرض اردو کا ماضی شاندار رہا ہے۔ اس زبان کی شیرینی، جاذبیت اور جامعیت کے گن بلا لحاظ مذہب و ملت ہر شخص نے گائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اس وقت ریاست کے عوام کی سماجی، سیاسی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ ہر سال یہاں اردو کی معیاری اور مفید کتب ادب، سیاست، مذہب، صحافت، سیاحت، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ اور کئی دوسرے موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی منظر عام پر آرہی ہیں جن سے اردو زبان و ادب کے دامن کو وسعت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ آج جب کہ اردو زبان کو کمپیوٹر اور دوسرے الیکٹرانک میڈیا میں جگہ دے دی گئی ہے تو اس سے زبان کو گویا چار چاند لگ گئے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں ریاست جموں و کشمیر میں اردو کے تئیں کام کرنے والے مختلف اداروں اور انجمنوں، ریڈیو اور دور درشن کے پروگراموں کے علاوہ یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی ادبی سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کی موجودہ صورت حال تسلی بخش ہے اور اس کا مستقبل درخشندہ و تابندہ نظر آرہا ہے، حالاں کہ کچھ چیلنجز کا سامنا بھی اس کو

(بقیہ صفحہ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر و پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۹۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
http://www.atuh.org

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ___ (ادارہ)